www.KitaboSunnat.com

کتاب و حکمت

مولانا عبدالغفار حسن (مترجم)

تفسیری افادات ـــــ از حافظ ابن قیمؒ

راقم الحروف، طالب علمی کے زمانہ سے امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصانیف کے مطالعہ کا شیدائی رہا ہے، خاص طور پر حافظ ابن قیم کے تفسیری نکات نے بہت زیادہ متاثر کیا۔

آج سے پچاس سال قبل جب کہ میں مالیر کوٹلہ میں مدرسہ کوثر العلوم میں مدرّس تھا، یہ کوشش کرتا رہا کہ حافظ ابن قیم کی تمام تصانیف جمع کی جائیں اور ان میں سے تفسیری اجزا علیحدہ کرکے ان کا ترجمہ یا تلخیص کردی جائے۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے کئی تصانیف میں سے تفسیری مباحث کا ترجمہ کیا گیا۔ زیادہ تر بدائع الفوائد کے چار اجزا میں سے تفسیری نکات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

ظاہر بات ہے، یہ ترجمہ پچاس سال پہلے کا ہے، ہو سکتا ہے کہ کہیں ترجمہ میں روانی محسوس نہ ہو یا کہیں جھول نظر آئے یا ترجمہ غلط ہو جائے۔ اس لئے قارئین کرام سے درخواست ہے کہ جہاں کہیں وہ ترجمہ میں غلطی محسوس کریں تو الدین النصیحة کے مطابق اپنی تصحیح سے مطلع فرمائیں۔

واضح رہے کہ اس ترجمہ کے کافی عرصہ کے بعد ایک کتاب "التفسیر القیم" کے نام سے جس میں مولانا محمد اویس ندوی مرحوم نے تمام تفسیری عبارات ابن قیم کی مختلف تصانیف سے انتخاب کرکے یکجا کردی ہیں دستیاب ہوئی۔ ان تفسیری افادات کے مطالعہ سے اچھا خاصہ تفسیری ذوق پیدا ہو سکتا ہے اور سلف صالحین کے طریقہ کار کے دائرہ میں رہتے ہوئے فہم قرآن کا ذوق حاصل ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے اور توشہ آخرت بنائے۔ (مترجم)

تفسیر النصف الآخر من سورة الفاتحة

چند سوالات

سوال ۱: ﴿ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں یہ فقرہ بدل واقع ہوا ہے۔ جس سے صراط مستقیم کی تشریح و توضیح مقصود ہے۔ لیکن یہاں تو مخاطب اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے حضور میں اس کی وضاحت کی ضرورت ہی کیا ہے؟

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

○ جواب: اس آیت کا نزول بندوں کی تعلیم کے لئے ہوا ہے۔ یہاں یہ جتلانا مقصود ہے کہ دعا کرنے والے کو دعا کے وقت اس امر کا احساس و خیال ہونا چاہئے کہ کس قسم کا عقیدہ رکھنا لازمی ہے۔ جس سے اس کے عقیدۂ ایمان کی پرورش کامل طور پر ہو سکے۔ کیونکہ دعا، عبادت کا مغز ہے اور مغز ہڈی میں ہوتا ہے اور ہڈی گوشت و خون میں ہوتی ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ عقیدہ ایمان کا تصور دعاء کے وقت ضروری ہے تو یہ امر بھی لازم ہو گیا کہ خدا سے طلب، التماس اور سوال حمد و ثناء کے ساتھ ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں طلبِ ہدایت کے الفاظ ہیں، خیر و سعادت کی آمیزش بھی ہے۔ گویا داعی اس طرح اپنے اعتقاد کو بھی ظاہر کر رہا ہے اور ساتھ ہی اس صحیح عقیدے کے ذریعہ کہ راہ حق وہ صراط مستقیم ہی ہے اور یہ بھی کہ یہ راہ ان لوگوں کی ہے جن کو خدا نے اپنی نعمت و رحمت سے نوازا ہے، داعی خدا کے حضور میں پہنچنا چاہتا ہے۔ جب بندہ ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾ کہتا ہے اور مخالفینِ حق کو بھی یہی کہتے ہوئے سنتا ہے کہ ہم بھی حق پر ہیں۔ تو ایسے وقت میں بندے پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ان کے خلاف عقیدہ رکھے اور اس حق کے ظاہر کرنے کی کوشش کرے جو واقعی حق ہے۔ اس لئے ﴿ صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ ﴾ بطورِ بدل وضاحت کے لئے لایا گیا ہے تاکہ زبان بھی اس حق کے اظہار کی عادی ہو جائے۔ جو دل میں پیوست ہے۔ یہ اہم دعا دو بڑے فائدوں پر مشتمل ہے:

۱۔ فائدۃ الخبر، یعنی رستہ کی استقامت کے بارے میں خبر دینا اور یہ بتلانا کہ یہ رستہ وہی ہے جو اس نے اپنے اہل نعمت کے ساتھ خاص کیا ہے۔

۲۔ لازم فائدۃ الخبر، یعنی داعی خود اس راہ کی استقامت (سیدھے ہونے) کا اقرار کرتا ہے۔ اور اس اقرار کے بعد اپنے رب سے قرب چاہتا ہے۔

الحاصل یہ آیات چار فوائد پر مشتمل ہیں:

۱۔ اس راہِ مستقیم کی طرف ہدایت کی دعا مانگنا۔

۲۔ اس دعا کے ذریعہ رستہ کی استقامت کی خبر دینا۔

۳۔ اس استقامت کی تصدیق و اعتراف۔

۴۔ اس تصدیق کے ذریعہ خدا سے قرب حاصل کرنا۔

پانچواں فائدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کا حکم اس لئے دیا ہے کہ یہ بندہ اس کا محتاج ہے اور یہ کہ نجات و سعادت کا دار و مدار محض اسی کی ذات پر ہے۔ ایسی صورت میں بندہ پر لازم آتا ہے کہ جو کچھ وہ طلب کرتا ہے اس پر غور کرے۔ اور معانی کے فہم و تدبر میں پوری

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کوشش صرف کردے۔ یہاں "الصراط" کے وہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں کہ اگر بندہ ان پر غور کرے، اور کامل توجہ سے کام لے۔ تو اس سوال و طلب کی رغبت و حرص میں مزید اضافہ ہو جائے۔ اور اس سے اپنے آپ کو کبھی بھی بے نیاز نہ پائے۔

سوال ۲: "الصراط" پر اَلْ تعریف کے لئے کیوں لایا گیا ہے۔ نکرہ لانے میں کیا قباحت تھی؟

○ جواب: عربی بلاغت کا یہ قاعدہ ہے کہ جب موصوف پر الف لام داخل ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ موصوف اس صفت کا زیادہ حقدار ہے۔

حدیث میں ہے "انت الحق ووعدك الحق وقولك الحق" اخیر میں فرمایا "والجنة حق والنار حق" مذکورہ بالا قاعدہ کی روشنی میں اس روایت کے الفاظ میں غور و فکر کریں۔ ایسی اشیاء کے ناموں کے بعد حق پر الف لام نہیں لایا گیا ہے جو غیر قدیم (حادث) ہیں یعنی جنت اور جہنم لیکن اسم رب، اس کے وعدہ اور کلام کے بعد حق پر اَلْ لایا گیا ہے۔

اگر اھدنا صراطا مستقیما کہا جاتا تو یہ معنی ہوتے کہ ایک غیر معین رستہ کی طرف ہدایت کردے۔ حالانکہ یہاں وہ معین رستہ مراد ہے جو رب تعالیٰ نے اپنے انعام یافتہ بندوں کے لئے بنایا ہے۔ اور اسی راہ پر چل کر انسان اپنے خالق کی رضا اور خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہ حق وہی دین حق ہے جس کے علاوہ کوئی دین بھی صحیح معنوں میں دین کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہی دین ہے جو ایک جانا بوجھا راز ہے۔ جس کی معرفت، تصدیق اور تمام غلط راہوں سے اس کی امتیازی شان دل میں سمائی ہوئی ہے۔ اسی بنا پر صراط کو یہاں معرفہ لایا گیا ہے۔

سوال ۳: مندرجہ ذیل آیات میں صراط کو نکرہ کیوں لایا گیا ہے:

(۱) ﴿ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴾ (الفتح:۲)

(۲) ﴿ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴾ (الشوریٰ:۵۲)

(۳) ﴿ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴾ (الانعام:۶۷)

(۴) ﴿ قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴾ (الانعام:۱۶)

○ جواب: ان سب آیات کا حل ایک ہی ہے۔ ان آیات میں جملہ خبریہ مستعمل ہے۔ صراط مستقیم کے بارے میں خبر دی جارہی ہے۔ طلب و سوال مقصود نہیں ہے۔ الف لام کو وہاں لایا جاتا ہے جہاں عبارت میں پہلے اس کا ذکر آچکا ہو یا مخاطب کو پہلے سے علم ہو۔ یہاں دونوں باتوں میں سے کوئی بھی نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا نکرہ لایا گیا ہے۔ اسم کی اصل حالت تنکیر (نکرہ لانا) ہی ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں معاملہ ہی دوسرا ہے۔ جب مومنین کے نزدیک ایک بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ایک صراط مستقیم ہے۔ جس کی طرف اس نے اپنے پیغمبروں کو ہدایت فرمائی ہے تو اب

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دعا کے مقام پر یہ امر واضح ہے کہ جس سے ہدایت طلب کی جارہی ہے، وہ ہی "الصراط" کا علم رکھتا ہے۔ یہاں الف لام کا لانا عجیب لطافت و حکمت پر مبنی ہے۔ اس مقام پر امام سہیلیؒ نے دوسری توجیہ کی ہے جس کو مصنفؒ نے کمزور قرار دیا ہے۔

سورۃ الفتح کی ابتدائی آیات کی تفسیر

غور کریں: رب تعالیٰ نے اپنے حبیب خاتم الرسل ﷺ کے لئے سورۃ الفتح کی ابتدائی آیات میں پانچ قسم کے عطیات کو بیان فرمایا ہے:

۱۔ روشن اور ممتاز فتح و کامیابی
۲۔ اگلی اور پچھلی لغزشوں کی معافی
۳۔ صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت
۴۔ رسول اللہ ﷺ پر اپنی نعمت کی تکمیل
۵۔ کامل نصرت و تائید کی بخشش

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے نبی ﷺ کے لئے ہدایت و نصرت دونوں کو جمع کردیا ہے۔ ان دونوں ہی کے ذریعہ فلاح و سعادت کمال کو پہنچتی ہیں۔ ہدایت اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کے دین کا علم اور اس کی اطاعت کا نام ہے۔ اسی کو علم صالح اور عمل نافع بھی کہہ سکتے ہیں۔

"نصر" سے مراد یہ ہے کہ اس کے دین کو جاری اور نافذ کرنے کی پوری قدرت حاصل ہو۔ یہ نصرت (مدد) دو قسم کی ہے:

۱۔ برہان، حجت، قوتِ بیان، دلائل: اس صورت میں دلوں کو مغلوب و تابع کیا جاتا ہے۔
۲۔ تیغ و سنان اور ظاہری اسلحہ: ان کے ذریعے انسانی اجسام کو شکست دی جاسکتی ہے۔

قرآن نے ان دونوں اصولوں کو متعدد جگہ یکجا بیان کیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے ذریعہ ہی دین کی تکمیل اور غلبہ دین حاصل ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾
(سورۃ توبہ: ۳۳)

"یعنی خدا وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا، ہدایت اور دین حق دے کر تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کردے"۔

سورۃ حدید میں فرمایا:

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ (الحدید: ۲۵)

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"بے شک ہم نے بھیجا رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ۔ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو اتارا۔ تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم ہو جائیں"

یہاں الکتاب سے مراد ہدایت ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾

"اور ہم نے لوہا اتارا، اس میں سخت قوت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں"

یہاں الحدید سے مراد مادی قوتیں اور اسلحہ ہے۔ اس آیت میں بھی ہدایت (الکتاب) اور نصرت (الحدید) کو یکجا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی ابتداء میں ہے:

﴿ الٓمّٓ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ﴾

"اللہ ہی اکیلا معبود ہے، وہ زندہ اور نگران ہے۔ اس نے حق کے ساتھ کتاب کو اتارا، اس طور کہ وہ پہلی آسمانی کتب کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اور اس نے تورات و انجیل کو اتارا، اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے اور الفرقان کو نازل کیا۔"

یہاں ہدایت کے ساتھ الفرقان کو بیان کیا گیا ہے۔ "الفرقان" سے مراد وہ مدد ہے جس کے ذریعے حق و باطل میں فرق کیا جاسکے۔ یہاں ہدایت و نصرت کو یکجا اس لئے لایا گیا ہے کہ ان دونوں سے حق و باطل میں پورا پورا امتیاز ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ نے اپنی نصرت و تائید کو فرقان کہا ہے:

﴿ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ﴾

"اور جو ہم نے اُتارا اپنے بندے پر فرقان کے دن جب کہ دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ ہوئی" (الانفال:۴۱)

یوم الفرقان، بدر کا دن ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی تائید اور ان کے دشمنوں کی رسوائی سے حق و باطل کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیا۔ اور اسی قبیل سے یہ آیت ہے:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾

(الانبیاء:۴۸)

"اور ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو الفرقان، روشنی اور ذکر عطا کیا"

الفرقان سے مراد وہ نصرتِ الٰہی ہے جس کے ذریعے فرعون اور اس کی فوجوں پر غلبہ حاصل ہوا۔ ضیاء اور ذکر سے مراد تورات ہے۔

سوال ۳: صراط کا ماخذ کیا ہے اور اصلی معنی کیا ہیں؟

○ جواب: عربی زبان کا محاورہ ہے: صرطت الشیئ یعنی میں نے اس کو بسہولت نگل لیا۔ رستہ کو صراط اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ گزرنے والے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی منتقل کر دیتا

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ گویا ان کو نگل جاتا ہے۔ صراط اسی رستہ کو کہیں گے جس میں یہ پانچ اوصاف پائے جائیں:

۱۔ مستقیم (سیدھا) ۲۔ آسان

۳۔ آباد، چلتا پھرتا ۴۔ کشادہ

۵۔ منزل مقصود تک پہنچا دینے والا

ٹیڑھے، دشوار گزار اور بند رستہ کو صراط نہ کہیں گے۔ عربی کلام کے مواقع استعمال پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ جریرؒ نے کہا ہے کہ:

امیر المومنین علی صراط اذا أعوج الموارد مستقیم

"جبکہ دوسرے گذرگاہیں کج اور ٹیڑھی ہیں۔ تو امیر المومنین سیدھے رستہ پر ہیں"

صِراط بروزن فِعَال ہے۔ یہ وزن زیادہ تر ان اشیاء کے لئے آتا ہے جو دوسرے پر مشتمل اور چھا جانے والی ہوں۔ رستہ میں چلنے والا اسی طرح اس میں سما جاتا ہے جس طرح کہ حلق میں نگلی ہوئی چیز حلق میں۔ اسی وزن پر یہ الفاظ آتے ہیں۔ ان کے معانی پر غور کریں: لحاف، فراش، خمار، رداء، غطاء، کتاب ـــــ یہ وزن تینوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔

۱۔ مصدر: جیسے قتال، خراب

۲۔ بمعنی مفعول: جیسے کتاب، غراس، بناء

۳۔ بطور آلہ: خمار (اوڑھنی)، غطاء (ڈھکنا)، سداد (ڈاٹ)

یہ الفاظ بطور آلہ کے استعمال ہوتے ہیں اور مفعول اس میں وہ چیز ہے جو ڈھانکی اور اوڑھی جاتی ہے۔ اسی تیسری قسم سے ہے: آلَہ بمعنی مألوہ۔ سورۃ الاحقاف میں بجائے صراط کے طریق لایا گیا ہے۔ اس میں ایک خاص نکتہ ہے۔ مکمل آیت یوں ہے:

﴿ إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُسْتَقِيمٍ ﴾ (احقاف:۳۰)

یہاں مؤمن جنوں کا کلام نقل کیا گیا ہے۔ پہلے انہوں نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ بتلایا ہے کہ جو کتاب وہ سُن کر آئے ہیں وہ تو ان کی تصدیق ہی کرنے والی ہے۔ گویا انہوں نے ہر طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول ﴿ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ ﴾ (الاحقاف:۹) کو دہرایا ہے۔ یعنی میں کوئی پہلا رسول نہیں ہوں بلکہ مجھ سے پہلے بھی رسول آچکے ہیں۔ میں ان کی تصدیق اور پیغام کو زندہ کرنے والا ہوں۔ اسی بنا پر انہوں نے لفظ طریق استعمال کیا۔ طریق بمعنی مطروق۔ یعنی پامال چلتا پھرتا آباد رستہ۔ اس پر پہلے بھی انبیاء کرام چل چکے ہیں۔ یہ کوئی اچھوتا اور انوکھا رستہ نہیں ہے۔

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ظاہر ہے کہ جب حضرت محمد ﷺ کا پیش کیا ہوا رستہ انوکھا اور نیا نہیں ہے تو مخاطبین کو یہی زیب دیتا ہے کہ جس طرح وہ رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ اسی طرح نبی خاتم الرسل ﷺ پر بھی ایمان لے آئیں۔ لفظ طریق لاکر آنحضور ﷺ کی اتباع کی پرزور تاکید و تنبیہ کردی گئی۔

سوال ۴: صراط الذین، یہاں الذین مبہم لفظ کیوں لایا گیا۔ کیا صراط النبیین مناسب نہ تھا؟

○جواب: اس طرز بیان سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ انعام یافتہ ہونا محض اس بنا پر ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کو پاچکے ہیں۔ اس قسم کا اندازِ بیان قرآن مجید میں بہت سی آیات میں ملے گا۔ اس کا نام تعلیق الحکم بالصلہ ...... اس میں جو لطافت ہے وہ صراحۃً نام ذکر کردینے میں نہیں ہے، مطلب یہ ہوا کہ انعام اس بنا پر ہے کہ وہ راہِ ہدایت پر چل رہے تھے۔ حسبِ ذیل آیات میں بھی یہی طرز اختیار کیا گیا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ ــــــــ ﴿ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ ــــ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾

فائدہ: اس آیت میں دل سے تقلید کا ازالہ اور یہ یقین دلانا ہے کہ جس نے اس ہدایت کی طرف راہ پالی، وہ انعام الٰہی کا حقدار ہوگیا۔ یہاں سائل اللہ تعالیٰ سے ہدایت و انعام کا طالب ہے۔ یہی سوال اس کے ذہن میں پرورش پا رہا ہے۔

ذکر کیے گئے پہلے فوائد کی طرف نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ فائدہ نمبر ا کا منشا یہ تھا کہ اہل ہدایت انعام یافتہ ہیں۔ اور فائدہ نمبر ۲ سے مقصود ہدایت کی طلب اور سوال ہے۔ فائدہ نمبر ۳ الذین انعمت علیہم، انعام یافتہ لوگوں کے تمام طبقات کو شامل ہے۔ کسی اسم خاص کے لانے سے یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ الذین سے مراد انبیاء کرام، صدیقین، صالحین، شہداء سب ہیں۔ یہ سوال نہایت اہم ہے، اور یہ مطلوب نہایت ہی شاندار مطلوب ہے۔ اگر دعا کرنے والا اس دعا کی اہمیت اور عظمت کو پہچان لے تو اس کا ایک سانس بھی اس سے خالی نہ جائے۔ اس سوال نے دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کو سمیٹ لیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دن رات میں اس کا بار بار دہرانا فرض کیا ہے۔ کوئی دوسری سورت اس کے قائم مقام نہیں ہوسکتی۔

سوال ۵: "مغضوب علیہم" کے وزن پر منعم علیہم کیوں نہ کہا گیا۔ اَنْعَمْتَ لانے میں میں کیا حکمت ہے؟

○جواب: قرآن حکیم کا یہ معلوم و معروف انداز بیان ہے کہ خیر واحسان اور جود و کرم کے افعال کو صراحۃً براہِ راست خدا کی طرف منسوب کرتا ہے اور جزا اور انتقام کے افعال کے واسطے

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فاعل کو ذکر کئے بغیر صیغہ مجہول لاتا ہے۔ ادب و احترام کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہی اسلوب اس آیت میں بھی برتا گیا ہے۔ فعل انعام کی نسبت صراحۃً خدا کی طرف کی گئی ہے اور غضب کے بیان میں فاعل کو ذکر نہیں کیا گیا۔

قرآنی شواہد

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ، وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ، وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴾ (الشعراء:۸۰)

"وہ خدا جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو ہدایت دیتا ہے اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور سیراب کرتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے"

ان آیات میں پیدا کرنے اور ہدایت دینے اور کھلانے پلانے کی نسبت حضرت خلیل علیہ السلام نے خدا کی طرف کی ہے۔ اور بیماری کو اپنی طرف منسوب کیا: مَرِضْتُ کہا، اَمْرَضَ نہیں کہا۔ (یعنی وہ مجھ کو بیمار کرتا ہے)

۲۔ مومن جنوں کا قول قرآن نے یوں نقل کیا ہے:

﴿ وَاَنَّا لَا نَدْرِیْ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴾

"اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کے ساتھ بھلائی چاہی ہے" (الجن:۱۰)

یہاں ارادہ رُشد کے فاعل کو صراحۃً بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ارادہ شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی گئی۔

۳۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا ﴾ (الکہف:۷۹)

میں نے چاہا کہ اس کشتی کو عیب دار بنا دوں۔

یہاں کشتی کو عیب دار کرنے کی خواہش کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن آگے چل کر یتیم بچوں کے قصہ میں فعل خیر کے ارادہ کی نسبت اللہ کی طرف کی ہے:

﴿ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ یَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَیَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ﴾

"پھر تیرے رب نے چاہا کہ وہ بلوغت کو پہنچ جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ تیرے رب کی رحمت کی بنا پر ایسا ہوا"

۴۔ ﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِكُمْ ﴾

اُحِلَّ بصیغہ مجہول لایا گیا ہے کیونکہ رفث (جماع) کے ساتھ فاعل کی تصریح مناسب نہ

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔ لیکن ﴿ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ یہاں اس قسم کی قباحت نہ تھی اسی انداز پر حسب ذیل آیات کو پڑھیں اور ان پر غور کریں:

۱- ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ ﴾ (المائدہ:۳)

۲- ﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ﴾ (الانعام:۱۵۱)

۳- ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ ﴾ (النساء:۲۳)

۴- ﴿ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ ﴾ (النساء:۲۴)

۵- ﴿ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ ﴾ (النساء:۱۶۰)

آخری اس آیت میں تحریم کے فاعل کو صراحۃً بیان کیا گیا ہے۔ مگر مومنین کے حق میں یوں کہا گیا ہے۔ ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ ﴾

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے انعام سے سرفراز فرمایا، اس بنا پر اس کا شکر مومنوں پر واجب ہے۔ شکر کی صورت یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کو ذکر کیا جائے اور اس کی اطاعت میں سرگرم رہا جائے۔ اس شکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس ضمیر کو بھی ظاہر کر دیا جائے۔ جس کے بیان سے منعم حقیقی کا ذکر زبان پر آجاتا ہے، اسی بنا پر انعمت علیہم کو منعم علیہم پر فوقیت حاصل ہوئی۔ یہ کلام توحید کی دو بنیادوں ذکر و شکر پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے:

﴿ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴾ (سورۃ البقرہ:۱۵۲)

"تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا، میرا شکر کرو اور میری ناشکری مت کرو"

تیسری وجہ: ہدایت کا انعام صرف خدا کی طرف سے ہے اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ خصوصیت کے ساتھ ضمیر واحد کے ذریعہ اس حقیقت کو بے نقاب کیا جاتا۔ یعنی تو ہی تنہا اس نعمت کا مالک ہے اور بخشنے والا ہے۔ لیکن غضب کا معاملہ دوسرا ہے۔ اللہ خود صراطِ مستقیم سے ہٹنے والوں پر غصہ ہوا، اور اس نے اپنے صالحین بندوں کو حکم دیا کہ وہ بھی اس کی پیروی میں ان پر غضب ناک ہوں۔ بندگی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ رب جس سے راضی ہو اس سے بندہ بھی خوش اور رب جس سے ناراض ہو۔ مومنین کی بھی یہی شان ہے کہ وہ ان سے ناراض ہوں، اس لئے یہاں فاعل کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس غضب میں صالحین بھی حصہ دار ہیں۔ بخلاف انعام کے وہ محض اللہ کے ساتھ خاص ہے اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

چوتھی وجہ: مغضوب علیہم کی حیثیت ہی ایسی ہے کہ ان سے اعراض و بے توجہی لازمی ہے۔ اس لئے صرف صفت کی طرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔ ان کی ذات کو بتلانا مقصود نہیں ہے۔ لیکن اہل نعمت کے ذکر میں ان کی ذات سرتاپا ہدایت کی طرف بھی اشارہ ضروری تھا۔ اس لئے الذین

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لایا گیا ہے۔ المغضوب میں اَلْ بھی الذین کے معنی میں ہے۔ لیکن وہ بات کہاں جو الذین کو صراحۃً لانے میں ہے۔

سوال ۷: کیا وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں اِھْدِنَا کا تعلق مفعول الصراط کی طرف براہِ راست ہے۔ لیکن دوسری آیات میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں حروفِ جارہ لام اور الی کا ذکر بھی موجود ہے۔

○ جواب: فعلِ ہدایت کا تعلق اپنے مفعول سے کبھی براہِ راست ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ ل یا الی ہوتا ہے۔ یہ تینوں صورتیں قرآن میں مذکور ہیں۔ براہِ راست کی مثال ایک تو یہی آیت ہے۔ دوسری ﴿ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴾ ـــــ بواسطہ الی، جیسے:

﴿ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴾ (الشوریٰ:۵۲)

بواسطہ "ل" جیسے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا

﴿ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ ﴾ (الاسراء:۹)

انداز بیان کا یہ فرق ایک خاص قاعدہ کے ماتحت ہے۔ جب کسی فعل کا استعمال متعدد حروفِ جارہ کے ساتھ ہوتا ہے تو ہر ایک حرفِ جر کے ساتھ ایک خاص معنی ہوں گے جو دوسرے حرف جر لانے کی صورت میں مراد نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ حروف کے معانی مختلف ہیں۔ مثلاً رغبتُ فیہ، رغبتُ الیہ اور عدلتُ الیہ، اور عدلتُ منہ میں فرق ہوگا۔ اس معنوی اختلاف کو نہ سمجھنے سے آیات کا فرق ملحوظ نہیں رہ سکتا۔ اور ظاہر بین نحویوں نے ھَدَیْتُ لکذا اور الی کذا کو ایک جیسا قرار دے دیا۔ لیکن فقہاءِ اہل عربیت اس سطحیت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ فعل کے معنی ہر ایک حرف کے ساتھ الگ متعین کرتے ہیں اور دوسرے حرف کا ساتھ دوسرے معنی مراد لیتے ہیں۔ پھر وہ اس نام اور اس فعل کو نگاہ میں رکھتے ہیں جس کو اس حرف سے مناسبت اور لگاؤ ہے۔ پھر دوسرے فعل کو پہلے فعل کے معنی پہنا دیئے جاتے ہیں۔ یہ سیبویہ اور اس کے اصحاب کا طریقہ ہے جو بغیر لطافتِ ذہنی کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اس مسئلہ کو وضاحت کے ساتھ مثال سے سمجھیں: قرآن میں ہے ﴿ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ ﴾ یہاں یَشْرَبُ کو یَرْوِیْ کے معنی پہنائے گئے ہیں۔ اس لئے یہاں باء کو لایا گیا ہے۔ جو کہ یروی کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ اس مختصر طریقے سے ایک فعل یشرب کا ذکر صراحۃً اور دوسرے فعل کا اشارۃً ہوگیا۔ یَشْرَبُ بِهَا، یَشْرَبُ مِنْهَا سے کہیں زیادہ لطافت و فصاحت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں رَیّ (سیرابی) کی طرف بھی اشارہ ہوگیا۔ اگر صرف یروی بھا کہا جاتا تو شرب کے معنی ظاہر نہ ہوتے۔ یشرب بھا سے دونوں باتیں حاصل ہوگئیں۔

اسی اصول کے ماتحت یہ آیت بھی ہے: ﴿ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اَلِیْمٍ ﴾ ..... (الحج:۲۵) ــــ فعل ارادہ کا استعمال باء کے ساتھ نہیں ہوتا ہے۔ یہاں ھَمَّ کے معنی یُرِدْ کو پہنائے گئے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ محض ھَم (نیم پختہ ارادہ) بھی اگر الحاد کا ہو جائے تب بھی عذاب کا سزاوار ہوگا۔ اس قاعدے اور نظائر و شواہد کو جان لینے کے بعد اصل مقام پر غور کریں۔ لفظ ہدایت کا استعمال جب الی کے ساتھ ہوگا۔ اس صورت میں اس کے معنی ہوں گے منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ اور جب "ل" آئے گا تب معنی ہوں گے کسی شے یا شخص کو مطلوب کے ساتھ خاص کر دینا۔ کہا کرتے ہیں کہ "ھدیتہ لکذا یعنی: ذکرتہ لہ، جعلتہ لہ، ھیّأتہ لہ وغیرہ ﴿ اِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ ﴾ کے معنی ہوں گے کہ قرآن خاص اس رستہ کو بتلاتا ہے جو تمام راستوں سے زیادہ درست ہے۔ (مترجم)

اور جب ہدایت کا تعلق مفعول سے براہ راست ہوگا تو ان میں سے کسی ایک معنی کی خصوصیت نہ ہوگی بلکہ تمام معنی مراد ہوں گے۔ ﴿ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴾ کہنے کا منشا یہ ہوا کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے سوال کر رہا ہے کہ مجھے سیدھی راہ بتلا دے، اس کو میرے لئے واضح کردے۔ دل میں اس کا الہام ڈال دے، اور اس پر قادر بنا دے۔ اس راہ کے علم و ارادہ سے سرفراز فرمادے۔ معنی کی یہ وسعت اور جامعیت حرفِ جر نہ لانے سے ہی پیدا ہوئی ہے۔

سوال ۸: اللہ تعالیٰ نے اہل ہدایت ہی کو نعمتوں کے ساتھ خاص کیوں کیا ہے۔ کیا کافر خدا کی نعمتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے؟

○ جواب: اس بارے میں اہل علم کے دو گروہ ہیں:

۱۔ ایک کا خیال ہے کہ کافر پر اللہ کی نعمت ہی کوئی نہیں ہے۔ اللہ نے خود فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ ﴾

"یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جو انعام یافتہ لوگوں کے ساتھ ہوں گے" (النساء:۶۹)

اس آیت میں فرمانبرداروں کے لئے انعام یافتہ طبقات کی معیت و رفاقت کو خاص کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ کفار اس سے محروم ہیں۔ نیز فرمایا: ﴿ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ ﴾

"اور تاکہ پوری کردوں اپنی نعمت تم پر"۔

اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ انعام، سزا اور انتقام کے منافی ہے۔ اس شخص کے لئے کون سی نعمت ہو سکتی ہے جو دائمی عذاب کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

جبکہ دوسرا گروہ، کفار کے لئے نعمت کا قائل ہے۔ اس کے دلائل یہ ہیں:

﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا ﴾ (ابراہیم:۳۴)

"اور اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو تم شمار نہیں کرسکتے"

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿ یٰبَنِیٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ ﴾ (البقرہ:۴۰)

"اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی ہیں"

یہ خطاب یہود سے ہو رہا ہے جب کہ وہ کفر کی حالت میں تھے۔ سورۂ نحل میں ہے:

﴿ کَذٰلِکَ یُتِمُّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴾ (النحل:۸۱)

"اللہ اس طرح پوری کرتا ہے اپنی نعمت تم پر تاکہ تم مسلمان بن جاؤ۔ پھر بھی اگر تم اعراض کرو تو اے نبی تمہارے نبی پر واضح طور سے پیغام پہنچا دینا ہے"

﴿ یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَھَا وَاَکْثَرُھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ﴾ (النحل:۸۳)

"اللہ تعالیٰ کی نعمت کو پہچانتے ہیں۔ پھر اس کا انکار کر دیتے ہیں اور اکثر ان میں سے کافر ہیں"

یہ آیت اس بارے میں نصِ واضح ہے کہ کافر بھی خدا کی نعمت سے مستفید ہوتے ہیں۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ مومن و کافر سب ہی خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کھلی ہوئی حقیقت کا انکار ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے ان دونوں گروہوں کے درمیان اعتدال و میانہ روی کی راہ یہ بتلائی ہے کہ کامل نعمت اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے۔ اس میں کوئی کافران کا شریک نہیں ہے۔ باقی رہی مطلق نعمت یعنی نعمتوں میں سے کچھ حصہ تو اس میں مومن و کافر سب شریک ہیں۔ نعمتِ کاملہ اور رحمتِ تامہ کا دامن ابدی سعادت اور دائمی راحت سے بندھا ہوا ہے۔ یہ غیر مشترک اور مخصوص ہے اور مطلق نعمت سے ساری مخلوق بلا تخصیص فائدہ اٹھاتی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ﴿ یٰبَنِیٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا ﴾ میں اللہ تعالیٰ یہود کو وہ نعمتیں یاد دلا رہا ہے جو اس کے آباء و اجداد پر نازل ہوئیں۔ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک ایک کر کے اپنی نعمتوں کا شمار کیا ہے: فرعون سے نجات، سمندر میں رستہ بن جانا، موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کا وعدہ، ان کے بعد بنی اسرائیل کی گمراہی، پھر توبہ اور معافی، بادلوں کا سایہ، من و سلویٰ کا اُترنا وغیرہ وغیرہ۔ ان نعمتوں کے ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ یہود ایمان و اطاعت پر آمادہ ہو جائیں اور خدا کی نافرمانی سے باز رہیں ورنہ وہی حشر ان کا بھی ہو گا جو ان کے اسلاف کا ہو چکا ہے۔ ان کے اسلاف پر انعام، ان پر انعام کے ہم معنی ہے۔ اس لئے ان پر بھی شکر لازم ہے۔ اب بجائے شکر کے کفر اور بجائے تصدیق کے تکذیب و عداوت اختیار کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ بہرحال یہاں حالتِ کفر میں نعمتِ کاملہ مراد نہیں ہو سکتی۔

سوال ۹: غیر المغضوب علیھم کے بجائے لا المغضوب علیھم کیوں نہیں کہا گیا؟

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

○جواب: اصل میں لا کا استعمال اثبات کے بعد ہوتا ہے۔ کہا کرتے ہیں:

جاءنی العالم لا الجاهل "میرے پاس عالم آیا، جاہل نہیں آیا"

لا عطف کے لئے آتا ہے۔ لیکن غیر، اپنے ماقبل کا تابع ہوتا ہے اس میں وصفی معنی پائے جاتے ہیں اور لا کے ہم معنی نہیں ہے۔ یہاں عطف کے بجائے صفت کے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ عطف اور وصف کے فرق کو سمجھ لینے سے اس آیت کی لطافت واضح ہو جائے گی۔ لا المغضوب علیهم کے معنی اس سے زیادہ نہ ہوں گے کہ مغضوب علیهم سے صراط کی نسبت سلب کرلی جائے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ: جاءنی العالم لا الجاهل ـــــ اس کے معنی بس اتنے ہی ہیں کہ عالم کے لئے مجئی (آنا) ثابت اور جاہل سے اس فعل کی نفی کردی جائے۔ مگر غیر اپنے سے پہلے کلمہ کی صفت ہوتا ہے۔ اس طرز بیان سے دو وصف حاصل ہوئے۔ ایک وصف ثبوتی (منعم علیہم) دوسرا سلبی غیر المغضوب علیہم۔ لا کے ذریعہ جو فائدہ حاصل ہو سکتا تھا وہ بھی حاصل ہو گیا اور ساتھ ہی مزید حمد و ثنا ثابت ہو گئی۔ اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اہل ایمان غضب والوں سے قطعاً مختلف ہیں، وہ غضب کے مستحق نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر یہاں بطور صفت کے لایا گیا ہے نہ کہ بصورتِ استثناء۔ دوسری حالت میں وصفی معنی فوت ہو جاتے جو کہ اصل مقصود ہیں۔

دوسرا فائدہ: اہل کتاب یہود و نصاریٰ اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم ہی انعام یافتہ ہیں، مسلمان نہیں۔ تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ انعام یافتہ تم نہیں بلکہ تمہارے غیر ہیں۔ اور مسلمانوں سے خطاب ہے کہ نعمت والے تم ہو نہ کہ تمہارے غیر۔ یہاں لفظ غیر پوری طرح مغائرت (اجنبیت) کو بتلا رہا ہے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں یہود و نصاریٰ کا صراحۃً نام نہیں لیا گیا ہے۔ ان کے وصف کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی صفات مغضوبیت و ضلالت کو بے نقاب کرنا مقصود ہے۔ اور یہ کہ ان کی راہ، انعام یافتہ مومنین کی راہ سے بالکل الگ ہے۔ اس لئے کہ انعامِ کامل، غضب و ضلال کے یکسر منافی ہے۔ یہ انعام کامل کسی مغضوب علیہ اور ضال کے لئے ثابت نہیں ہو سکتا۔

سوال ۱۰: غیر باوجود اضافت کے نکرہ ہی رہتا ہے۔ اس کو الذین (معرفہ) کی صفت کیسے قرار دے سکتے ہیں؟

○جواب: اس اعتراض کے کئی جواب دیئے جاسکتے ہیں۔ جن کا تذکرہ آئندہ صفحہ پر آئے گا۔ بعض لوگوں نے غیر کو بدل بھی بنایا ہے جو درست نہیں۔ بدل بنانا تین وجوہ سے درست نہیں، پہلی وجہ یہ ہے:

۱۔ مبدل منہ (متبوع) اور بدل (تابع) ـــــ ان دونوں میں سے دوسرا اسم اصل

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقصود ہوتا ہے۔ اور پہلا اسم بطور تمہید لایا جاتا ہے۔ مثلاً:

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (آل عمران:۹۷)

"اللہ کے لئے لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے، ان پر جو رستہ کی استطاعت رکھتے ہیں"

یہاں من استطاع بدل واقع ہے اصل مقصود یہی ہے۔ الناس محض تمہید کے لئے آیا ہے۔ اسی طرح عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ:

اَعجبنی زید علمه ـــــ یعنی مجھے زید، اس کے علم نے لبھالیا۔

یہاں اصل مقصود علمہٗ ہے۔ زید صرف تمہید اذکور ہے۔ اسی انداز پر یہ دو آیتیں ہیں:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ﴾ (البقرہ:۲۱۷)

"وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں حرمت والے مہینے، اس میں لڑائی کے بارے میں"

یہاں سوال قتال سے ہے نہ کہ محض شہر حرام سے۔ یہاں اصل مطلوب قتال ہے نہ کہ الشهر الحرام ـــــ اسی طرح فرمایا:

﴿ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ، نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴾ (سورۃ العلق)

"ہم ضرور گھسیٹیں گے پیشانی کے بالوں سے، جھوٹی خطاکار پیشانی کے بالوں سے"

اس آیت سے بھی اصل مقصود ناصیۃ کاذبۃ ہے۔ الناصیۃ صرف تمہید لایا گیا ہے۔

اب اصل آیت کی طرف نظر کریں! یہاں منعم علیہم کا ذکر اور صراط کی نسبت، ان کی طرف درحقیقت مطلوب و مقصود ہے۔ اور غیر المغضوب بطور تکملہ اور تتمہ کے لایا گیا ہے۔ یہ وصف اصل مقصد کے لئے کمال و وضاحت پیدا کردیتا ہے۔ خود مقصود بالذات نہیں ہے۔

وجہ دوم: بدل، مبدل منہ کے لئے تاکید و تکرار کا حکم رکھتا ہے۔ اگر مبدل منہ کی جگہ بدل کو رکھ دیا جائے تو کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ مثلاً قرآن کے علاوہ اگر کسی عبارت میں یوں کہا جائے: "للہ حج البیت علی من استطاع الیہ سبیلا" تو غلط نہ ہوگا۔ یا کوئی اس طرح دعا مانگے: "اھدنی صراط من انعمت علیہ" تو اس کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر غیر المغضوب کو بدل مان لیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے کہ اس لفظ کو الذین انعمت علیہم کی جگہ رکھ سکتے ہیں حالانکہ اس صورت میں کلام کا اصل مقصود ہی فوت ہو جاتا ہے۔ مقصد تو یہ تھا کہ صراط کی نسبت الذین انعمت علیہم کی طرف کی جائے نہ کہ غیر المغضوب علیہم کی طرف۔ نیز غیر کے لانے سے اصل غرض تو یہ تھی کہ اہل نعمت کو حمد و ثنا میں لفظ غیر کے ذریعہ اضافہ کیا جائے۔

وجہ سوم: غیر بدل واقع ہو ہی نہیں سکتا۔ صفت، حال، استثناء: انہی تینوں صورتوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اصل وضع کے اعتبار سے اس کا استعمال مستقل طور پر نہیں ہو سکتا۔ صرف تابع کی حیثیت سے اس کو لایا جا سکتا ہے۔ "جاءنی غیر زید" بہت کم بولا جاتا ہے۔

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

بدل اور صفت میں فرق یوں سمجھیں کہ اول الذکر میں مبدل منہ بطور زینہ کے لایا جاتا ہے۔ اور مقصود بدل ہوتا ہے۔ جبکہ صفت میں اصل مطلوب موصوف ہوتا ہے۔ صفت وضاحت یا تشریح یا کسی اور فائدہ کے لئے لائی جاتی ہے۔ اب غور کرلیں ـــــ کیا یہاں غیر المغضوب بدل واقع ہو سکتا ہے۔؟

○جواب دوم: الذین اسم موصول مبہم غیر معین ہے، اس لئے اس کی صفت نکرہ ـــــ غیر کو لانا درست ہے۔ (اصل بحث میں کچھ سوال و جواب ہے جس کی افادی حیثیت عام فہم نہیں۔ اس لئے نظر انداز کر دیا گیا۔ مترجم)

○جواب سوم: یہاں غیر اضافت کی وجہ سے معرفہ ہو گیا ہے۔ غیر کے بعد معرفہ ہونے سے مانع، اس کا ابہام ـــــ عموم ہے۔ لیکن یہاں دو متضاد ـــــ وصفوں ـــــ کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اس لئے ابہام جاتا رہا اور تعین پیدا ہو گیا۔ یہاں غیر، انعمت اور مغضوب کے درمیان واقع ہے۔ اس کی نظیر کلام عرب میں یوں ملتی ہے:

نحن بنو عمرو بن لهجان الازهر، النسب المعروف غير المنكر

یہاں غیر، معروف اور منکر کے درمیان واقع ہے۔ اس لئے اس کا النسب معرفہ کی صفت قرار دینا صحیح ہوا۔ اسی طرح کہا کرتے ہیں: المحسن غير المسيئ والبر غير الفاجر

سوال ۱۱: ﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ کو بصورتِ بدل لانے کی کیا ضرورت تھی۔ مبدل منہ تو نیت میں ساقط الاعتبار ہوتا ہے۔

○جواب: مبدل منہ ـــــ علی الاطلاق ساقط الاعتبار نہیں ہوتا، بلکہ اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بدل بعض اور بدل اشتمال ـــــ یہاں مبدل منہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔

۲۔ بدل الکل ـــــ اس صورت میں بدل بمنزلہ تاکید اور یاددہانی کے لایا جاتا ہے۔ اور اس کے کلام میں نسبتِ اسنادی ـــــ کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ جب یہ کہا گیا کہ: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ "ہمیں سیدھی راہ" ـــــ تو دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ راہ ہمارے ساتھ ہی خاص ہے۔ یا ہم سے پہلے کوئی دوسرا بھی اس راہ پر چلا ہے۔ ﴿ صراط الذين انعمت عليهم ﴾ سے یہ سوال حل ہو جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے اس کی مثال یوں سمجھو کہ تم کسی انجان کو رستہ بتلا رہے ہو کہ یہ راہ تمہاری منزل مقصود تک پہنچے گی پھر تم اس کے اطمینان اور مزید تاکید کے لئے یوں کہتے ہو کہ یہ راہ وہ ہے جس پر تم سے پہلے بہت سے مسافر چل کر اپنی منزل مقصود پا چکے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں انجان مسافر کے دل میں سفر کا جو عزم اور بلند ہمتی پیدا ہو سکتی ہے وہ صرف رستہ بتلا دینے سے پیدا نہیں ہوتی۔ عام انسانی فطرت یہی ہے کہ کسی نمونہ کو دیکھے اور پھر میدان عمل میں کود پڑے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ